احمد بشیر کی اُردو مضمون نگاری

Ahmad Bashir's Urdu Essay Writing

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2024.08022215

ڈاکٹر ریاض احمد
Dr Riaz Ahmad
Lecturer, Department of Urdu
Govt. College University, Faisalabad

ڈاکٹر رابعہ سرفراز
Dr Rabia Sarfaraz
Head of Urdu Department
Govt. College University, Faisalabad

Abstract:

"Ahmad Bashir was a renowned journalist and a literary icon of Urdu. He wrote essays / articles and columns equally in English and Urdu. Among the various of his journalistic and literary facets, sketch-writing, novel-writing and editorial-writing are worth-mentioning. He got education in film-making from America, and then started film-making and direction in Pakistan. He produced few documentaries, and made the first and the last to date belly film of Pakistan "Chirree Kahaani" that achieved an award in belly film festival of Iran. He chose journalism for making his livelihood, and learnt journalism from Charagh Hassan Hassrat in the daily "Amroz". He was called the founder of Urdu feature-writing. He wrote his debut feature on Gaamma Pehalwaan. After the daily "Amroz", he started writing for the weekly "Qandeel". He never sticked long to a newspaper owing to his truthfulness and ideological thoughts. He was a staunch socialist and flag-bearer of social justice.

Keywords:

Amroz, Gaamma Pehalwaan, Qandeel, Social Justice, Chirree Kahaani, Iran.

احمد بشیر کی اُردو مضمون نگاری کا اعزاز بجا طور پر ماہنامہ نیا زمانہ کو جاتا ہے کیوں کہ ضیائی مارشلائی موسم اور ماحول

انھیں اور ان کے سوختہ مزاج اور اس دور کے اردو اخبارات کو راس نہ آیا اور احمد بشیر کو اپنا مافی الضمیر انگریزی اخبارات میں کبھی بلھے شاہ، کبھی شاہ عنایت اور کبھی احمد خاں کھرل کے نام سے بیان کرنا پڑا۔ اس دور میں احمد بشیر کی اُردو تحریریں نہ ہونے کے برابر ہیں ضیائی دور کے بعد بھی وہ انگریزی مضمون نگاری سے وابستہ رہے اور ساتھ ہی اپنا شاہکار اردو ناول لکھنے کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور ۲۰۰۰ء تک بھی انھیں کوئی اردو اخبار باقاعدہ میسر نہیں آیا۔ اس کا اردو زبان و ادب کو بہت فائدہ ہوا اور اس کا دامن ایک اور اچھے ناول سے معمور اور مالا مال ہوا اور ۲۰۰۰ء میں شعیب عادل نے جب "نیا زمانہ" کا آغاز کیا تو انھوں نے فقیر صحافت احمد بشیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کو پذیرائی اس وقت ملی جب سید سبط الحسن ضیغم نے اس بات کی حامی بھر لی کہ وہ کسی روز پرویز مجید اور شعیب عادل کو ان کے گھر لے جائیں گے اور ان سے اس شمارے کے لیے کچھ لکھنے کی گزارش کریں گے۔ ملاقات کا اہتمام ہو گیا اور کرنل عباس کے گھر میں انھیں کرائے کے بغیر رہنے کی سہولت میسر تھی۔ یہی گھرانہ اب ان کا آشیانہ تھا۔ کرنل عباس، ان کی بیگم جس کا نام قلزم ہے اور احمد بشیر کی چھوٹی صاحب زادی ہیں، نے انھیں اپنے گھر میں اس طرح رکھا اور سنبھالا کہ ان کا خواب ان کی ذات کی حد تک پورا ہو گیا تھا کہ بڑھاپے میں بزرگوں کی زندگی وبال نہ بنے۔ وہ اپنے بڑھاپے کی زندہ لاش اٹھا کر دربدر ٹھوکریں نہ کھائیں۔ اس ملاقات کا آغاز تو خاصہ مایوس کن تھا مگر سید سبط الحسن ضیغم مرحوم کی بروقت مداخلت اور اصرار کی بدولت اختتام بڑا امید افزا ہوا۔ اس ملاقات کے حوالے سے شعیب عادل لکھتے ہیں:

> "یہ اپریل ۲۰۰۰ء کی بات ہے جب کافی مشکلات کے بعد "نیا زمانہ" کا ڈیکلریشن ملا۔ ہم (میں اور پرویز مجید) پہلا شمارہ نکالنے کی بابت غور کر رہے تھے کہ احمد بشیر کا ذکر آیا اور طے پایا کہ ان سے ملا جائے۔ احمد بشیر سے ملانے کا ذمہ سید سبط الحسن ضیغم نے لیا اور ایک اتوار وہ ہمیں وہ ان کے گھر لے گئے میری زندگی میں ان سے پہلی ملاقات تھی عرض کی کہ ہم ایک نیا ماہنامہ شروع کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اس میں لکھیں۔ انھوں نے فوراً ہی ہمیں جھاڑ دیا کہ خبردار جو میگزین کا نام لیا۔ ہر ایرا غیرا میگزین نکالنے کی بات کرتا ہے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ یہ کیسے نکلتا ہے اور اس کے کیا مسائل ہیں۔ آپ کے پاس پیسہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم لوگوں کو کتنا تجربہ ہے؟ ہم نے کہا کہ کچھ بھی نہیں، نہ ہمیں صحافت کا تجربہ ہے اور نہ پیسہ ہے۔ صرف شوق ہے۔ مزاج میں جلالی پن تھا کہ عجیب بے وقوف ہو کہ نہ صحافت کا پتہ نہ پیسہ اور چلے ہو مجھے (کذا۔ مجھ) سے مضمون لکھوانے؟ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے پھر جان چھڑانے کے لیے کہنے لگے کہ بھئی جو کچھ میں لکھتا ہوں وہ آپ چھاپ نہیں سکیں گے۔ ہم سخت مایوس ہو گئے کہ اتنی امیدیں لے کر آئے تھے مگر یہاں سے کورا جواب مل گیا۔ سبط

الحسن ضیغم صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ شعیب ایک سہ ماہی رسالہ ''آواز'' کے نام سے نکال رہا ہے اور اس کے کچھ شمارے آپ کے مطالعے کے لیے لائے ہیں۔ آپ ان کا مطالعہ کریں اور ان نوجوانوں کے لیے کم از کم ایک مضمون تو ضرور لکھیں۔ انھوں نے ٹرخانے کے انداز میں ہاں کر دی اور ''آواز'' کے شمارے رکھ لیے۔ کچھ دن بعد ان کا فون آیا اور کہا کہ میں نے ''آواز'' کے شمارے پڑھے ہیں اور وہ مجھے بہت پسند آیا ہے لہٰذا میں نے مئی ۲۰۰۰ء (پہلا شمارہ) کے لیے یوم مئی پر مضمون لکھ دیا ہے اور آ کے لے جاؤ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی مضمون لیا اور پھر یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔''(۱)

اس تعلق نے احمد بشیر کو ریٹائر نہ ہونے دیا اور اردو صحافت اور تاریخ کو مزید وسعتیں ملیں اور لوگوں کو بشیر وی تحریریں مسلسل چار سال تک ملتی رہیں۔ احمد بشیر کو حوصلے کی دولت، بڑے لوگوں کی محبت اور اچھے دوستوں کی رفاقت علمی ریاضت کی بدولت میسر آئی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ اس مالِ بے مثال سے اپنی اور انسانیت کی عمارت تعمیر کی جائے۔ انھوں نے دنیاداری کے محل نہیں بنائے اور اپنے ضمیر کو دنیاوی آلائشوں سے آلودہ ہونے سے بچائے رکھا اور دنیاوی امیری کی بجائے فقیری جیسے طرزِ حیات کے خوگر بنے رہے۔ ان کے یہ مضامین شعیب عادل نے ''خون جگر ہونے تک'' کے نام سے کتابی صورت میں طبع کرائے۔

''خون جگر ہونے تک'' کے آغاز میں روایتی وضاحتوں کے بعد فہرست مضامین ہے جس کی تعداد چھیالیس ہے۔ ان سے قبل شعیب عادل ایڈیٹر ''نیا زمانہ'' کا آغاز ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہے اور آخر میں حمید اختر کے خطوط احمد بشیر کے مضامین کے جواب میں ہیں کتاب دو سو چورانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست مضامین کچھ یوں ہے پہلا مضمون کتاب کے صفحہ سات سے شروع ہوتا ہے مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ یوم مئی ہمیں کیا سکھاتا ہے (مئی ۲۰۰۰)
۲۔ قاضی حسین احمد کے اسلامی نظام کا خاکہ (جون ۲۰۰۰)
۳۔ کالم نگاروں کی قلابازیاں (جولائی ۲۰۰۰)
۴۔ پختون قوم پرستی کی جھلکیاں (اگست ۲۰۰۰)
۵۔ خرابیاں نہیں غلطیاں گنواؤ (ستمبر ۲۰۰۰)
۶۔ سنگ رابستند و سگ را کشادند (اکتوبر ۲۰۰۰)
۷۔ کشمیر میں جہان نو (جنوری ۲۰۰۱)
۸۔ دانیال لطیفی سے اس عاجز کا مختصر مکالمہ (فروری ۲۰۰۱)
۹۔ چندی گڑھ میں پنجابی وفد (فروری ۲۰۰۱)
۱۰۔ چل کراچی آگے چل (مارچ ۲۰۰۱)
۱۱۔ پاکستان کی دفاعی گہرائی (اپریل ۲۰۰۱)
۱۲۔ عالمی پنجابی کانفرنس (مئی ۲۰۰۱)
۱۳۔ ضیائی اسلام کی واپسی (جون ۲۰۰۱)
۱۴۔ کیا سوشلزم ناکام ہو گیا ہے (جولائی ۲۰۰۱)
۱۵۔ گدھے سے ایک فیصد زیادہ عقل (اگست ۲۰۰۱)
۱۶۔ فوجی آمریت یا فیوڈل آمریت (ستمبر ۲۰۰۱)

۱۷۔ رضوان احمد تم گپ مارو اور میں بولوں (اکتوبر ۲۰۰۱)
۱۸۔ ریاست اور موسیقی (نومبر ۲۰۰۱)
۱۹۔ امریکہ سب سے بڑا دہشت گرد (نومبر ۲۰۰۱)
۲۰۔ ہے تاخت چمن میں کسی کا ہاتھ (دسمبر ۲۰۰۱)
۲۱۔ انسانی حقوق، فیوڈل جمہوریت (جنوری ۲۰۰۲)
۲۲۔ لاہور میں بھارتی ٹیم (مارچ ۲۰۰۲)
۲۳۔ جمہوریت یا آمریت (اپریل ۲۰۰۲)
۲۴۔ ریفرنڈم اور نظریہ پاکستان (مئی ۲۰۰۲)
۲۵۔ یوم اقبال، یوم مئی، یوم ریفرنڈم (جون ۲۰۰۲)
۲۶۔ خلفشار (جولائی ۲۰۰۲)
۲۷۔ کھول آنکھ زمیں دیکھ (اگست ۲۰۰۲)
۲۸۔ دونوں کا حاصل خانہ خرابی (ستمبر ۲۰۰۲)
۲۹۔ ستمبر، ماضی حال اور مستقبل میں (اکتوبر ۲۰۰۲)
۳۰۔ نہ ہم بدلے نہ تم بدلے (نومبر ۲۰۰۲)
۳۱۔ وہ اپنی خو نہ بدلیں گے (دسمبر ۲۰۰۲)
۳۲۔ برادرانِ یوسف (جنوری ۲۰۰۳)
۳۳۔ سچا کھرا مسلمان (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) (فروری ۲۰۰۳)
۳۴۔ ہماری باری بھی آسکتی ہے (مارچ ۲۰۰۳)
۳۵۔ یہ کلچر کا مسئلہ ہے بے وقوف (اپریل ۲۰۰۳)
۳۶۔ نیا زمانہ کا کیا فائدہ (مئی ۲۰۰۳)
۳۷۔ ہندوستان زندہ باد (جون ۲۰۰۳)
۳۸۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات (جولائی ۲۰۰۳)
۳۹۔ اڈوانی جی کے کتنے لمبے ہاتھ (اگست ۲۰۰۳)
۴۰۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا (ستمبر ۲۰۰۳)
۴۱۔ سیر کراچی = غم دوش، فکر فردا، کیمونسٹ پارٹی (اکتوبر ۲۰۰۳)
۴۲۔ شیشہ گر و کچھ تو کرو (نومبر ۲۰۰۳)
۴۳۔ ڈاکٹر اسرار کی خدمت میں (دسمبر ۲۰۰۳)
۴۴۔ دامن کو ذرا دیکھ بند قبا کو دیکھ (جنوری ۲۰۰۴)
۴۵۔ ۴ سال اور ۵۶ سال (نیا زمانہ کے لیے آخری مضمون ہے) (مئی ۲۰۰۴) ۴۶۔ پنجاب اور پنجابیت (فروری ۲۰۰۴)

یہ مضامین ان کی علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، ثقافتی اور تاریخی معلومات کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں خصوصاً اردو میں چھپنے والے یہ مضامین بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نیا زمانہ میں شائع ہوئے اور یہ احمد بشیر کی سوچ کے بھرپور عکاس ہیں۔ انھوں نے ملا کلچر کے خلاف کھل کر لکھا اور اس کلچر کے اندر چھپی باتوں کو منظر عام پر لائے۔ ان کے ہاں ماضی میں ان کی حرکات کی وجہ سے اسلام کو ہونے والے نقصان اور معاشی عدم استحکام کا ذکر ملتا ہے اور ملاّ کریسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سرمایہ داری کے خلاف بھی بڑے بھرپور انداز میں لکھا اور مزدوروں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کیا۔ شامل کتاب مضمون ''یوم مئی ہمیں کیا سکھاتا ہے'' میں یہی فکر کارفرما ہے اور اس حوالے سے ملکی حکومتی اور سرمایہ داری کی سطح پر پیش آنے والی زیادتیوں کا احوال اس مضمون کا مرکزی تہ ہے اس کا اختتام کچھ یوں ہے:

> ''یوم مئی کا اصل حاصل یہ ہے کہ مزدوروں کے خلاف حکومت کے تمام ادارے، عدلیہ، پولیس اور کارخانہ دار متحد ہو کر قتل و خون پر آمادہ رہے ہیں۔ ہمارے مزدور راہنمائوں کو محض آنسو بہانے کی بجائے بات بتانی چاہیے ورنہ یوم مئی کا کوئی فائدہ نہیں اور اس کا ثبوت ہمیں اپنی

تاریخ میں بارہا مل چکا ہے کہ حکومت، کارخانہ دار، عدلیہ اور پولیس ایک طرف اور خالی ہاتھ لگی ملکی دولت پیدا کرنے والے بھوکے ننگے مزدور دوسری طرف یوم مئی ہمیں یہی سکھاتا ہے۔"(۲)

"کالم نگاروں کی قلابازیاں" کے عنوان سے لکھے اس مضمون میں اپنے صحافی بھائیوں کی خبر لی اور یہ بتایا ہے کہ یہ لوگ کس طرح سے اور کن طبقوں سے باقاعدہ بھتہ نما تنخواہ وصول کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی اس حرام کی کمائی میں اپنے ضمیر کی موت کی قیمت شامل کر لیں تو مال و منال کی ریل پیل ہو جاتی ہے۔ ان کی راج دربار میں عزت بھی بڑھ جاتی ہے اور وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ احمد بشیر کے ان متفرق موضوعات میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے طبقاتی نظام، مذہبی جبر، جاگیر دارانہ نظام اور منافقت کا خاتمہ۔ وہ ان تمام مسائل کا حل سوشلزم میں تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریاست کے کل پیداواری وسائل پر ایسی حکومت کا قبضہ ہو جس کے کارندے خود غریب ہوں مگر خود غرض نہ ہوں زمین کارخانے کانیں، جنگل چشمے، ذاتی ضروریات تک محدود ہو۔"(۳)

مساوات اور برابری احمد بشیر کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی اور یہی جذبہ انھیں سوشلزم کی طرف لے گیا اور وہ ایسے سوشلسٹ بن گئے جسے دوسرے سوشلسٹ بھی سچا سوشلسٹ کہتے تھے۔ وہ سچے انسان تھے، سچ بیانی ان کا وطیرہ تھا، خود غرضی اور ریاکاری کو وہ برداشت نہیں کرتے تھے اور بے لوث معاشرتی خدمت ان کا نصب العین تھا۔ اس لیے امتیاز عالم ان کی تمام جہتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باغی نقاد مارکسٹ، لادین، انتشار پسند فن کے دلدادہ فلم ساز، صحافی، چار بچیوں کے اچھے باپ، خود غرض خاوند، آوارہ گرد، مورخ یا معاشرتی ماہر۔۔۔ شاید وہ یہ سب کچھ تھے وہ ایک راہ کے راہی نہ تھے، آزاد منش تھے اور ایک ایسے معاشرہ کے خواہاں جو طبقات میں بٹا ہوا نہ ہو۔"(۴)

ان مضامین میں احمد بشیر کی پنجاب سے محبت جھلکتی ہے۔ یہ مضمون "خون جگر ہونے تک" میں شامل ہے۔ آمریت انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی اور خصوصاً ضیائی آمریت کے دور میں انھوں نے بڑے مشکل دن گزارے۔ نام بدل کر لکھنا بھی انھیں راس نہ آیا اور انھیں بار بار مختلف اخبارات سے نکال دیا جاتا اس کیفیت کو احمد بشیر بڑی وضاحت سے یوں بیان کرتے ہیں:

"ضیاء الحق نے اس فقیر کو اپنے گیارہ سالہ دور میں گیارہ نوکریوں اور اردو اور انگریزی کے چار اخبارات سے نکلوایا۔ پانچویں اخبار فرنٹیر پوسٹ سے وہ نہ نکلوا سکے کیوں کہ اس کا مالک رحمت

شاہ آفریدی ضیاء الحق سے جھاڑ کھالیتا تھا مگر مجھے نکالتا نہیں تھا اور اگر اس کے اخبار کو اشتہار نہیں ملے اور وہ ناکام ہو گیا تو اس کی ایک وجہ بلھے شاہ بھی تھا۔"(۵)

اس دور میں احمد بشیر کو کسی ایک اخبار میں ٹک کر کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں انھیں کسی ایک اخبار میں پورا سال کام کرنے نہ دیا گیا۔ ان کے رزق کی پرواز کے حامل طائر کے پر کاٹ دیے جاتے مگر احمد بشیر شاہ عنایت، احمد خان کھرل اور بلھے شاہ کے بہروپ میں اپنی تحریری اڑان بھرنے سے باز نہ آئے۔ پختون قوم پرستی کے حوالے سے لکھے گئے مضمون میں انھوں نے پختون قوم پرستی کی آڑ میں ملکی وحدت کو نقصان پہنچانے والے عناصر کو تنقیدی نشانہ بنایا ہے اور بتایا ہے کہ قوم پرستی کی حدیں کہاں تک پھیلانا جائز ہے اور اس حد سے تجاوز کے ملکی وحدت کو کیا کیا نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور ان میں کن پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو اپنی سیاست چمکانے کے لیے دوسری قوموں سے نفرت کا اظہار کر کے نہیں تھکتے اور اپنی قوم کی سچی خدمت کرنے کی بجائے انھیں اپنی کلاشنکوف زدہ اور دوسری قوم پر گالیوں کی گولیاں چلانے والی سیاست کی بھینٹ چڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں احمد بشیر لکھتے ہیں:

"خان عبد الغفار خان اور خان عبد الصمد اچکزئی کی عظمتوں سے کون انکار کر سکتا ہے انھوں نے انگریز کے خلاف جنگ بھی لڑی اور اپنے لوگوں کی خدمت بھی کی مگر ولی خان صاحب نے پختونوں کے لیے کیا کیا۔۔۔ انھوں نے پختون قوم پرستی کی کبھی وضاحت نہیں جناح کو گالیاں دینے یا اٹک کی طرف کلاشنکوف چلانے یا پنجابیوں کو غیر شائستہ گالیاں دینے سے پختون قوم پرستی کی خدمت نہیں ہوتی۔۔۔ قوم پرستی کی ایک ہی خرابی ہے اور وہ یہ کہ اس میں دوسری قوموں سے نفرت شرط ہے۔ سندھ میں بشیر قریشی اور پلیجو پنجابیوں کو گالیاں دیتے ہیں بلوچستان میں بگٹی صاحب کی آنکھیں چڑھی رہتی ہیں اور کراچی میں الطاف حسین آتش زیر پا ہیں۔ ان میں سے کسی نے کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی قوم کے کسانوں کو زمین اور مزدوروں کو کارخانے دیں گے۔"(۶)

قوم پرستی ان سیاست دانوں نے اپنی سیاست چمکانے کے لیے ایک نعرے کی حیثیت سے اپنے دلوں میں پال رکھی ہے۔ وہ قوم پرستی کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے جس کے لیے یہ لفظ وجود میں آیا اور لوگ واقعی اپنی قوم کی پرستش کریں۔ ان کی غلطیوں اور خرابیاں کے حوالے سے روزنامہ جنگ نے اپنے فورم پر ایک مباحثے کا اہتمام کیا تھا اور یہ مضمون اس مباحثے کا ردعمل ہے یا تکمیلی صورت۔ اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ دانشور بھی جھوٹ کو جھوٹ کہنے سے گریز کرتے ہیں اور اس وجہ سے غلطیوں اور خرابیوں کی نشاندھی اس مضمون کا حاصل ہے کہ خرابیوں نہیں غلطیاں گنواؤ۔ ان

خرابیوں کے حوالے سے احمد بشیر لکھتے ہیں:

"جب افغانستان میں انقلاب آیا (روسی اس کے ایک برس بعد آئے) تو پاکستان کا فارن آفس اسے تسلیم کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا ضیاء الحق اسلام آباد سے لاہور آ رہے تھے۔ پائلٹ نے اطلاع دی صدر کارٹر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ آدھے گھنٹے بعد جب ضیاء الحق لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوں گے تو کارٹر کی کال وصول کریں گے۔ کارٹر نے انھیں کہا کہ تم افغانستان کے انقلاب کو تسلیم نہ کرو بلکہ اس کے خلاف مورچہ لگاؤ ضیاء کو جاننے والے کہتے ہیں کہ ضیاء الحق اور جنرل عبد الرحمان نے کروڑوں روپے کمائے مگر پاکستان کو کیا ملا۔ ہیروئن، کلاشنکوف کلچر، مذہبی تشدد، جہالت، فرقہ پرستی، ایم کیو ایم کی دہشت گردی اور اعجاز الحق۔"(۷)

ہر وہ جرنیل جس نے اپنی آمریت اپنے ملک پر مسلط کی اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی جنگ ضرور چھیڑی۔ پاکستان اس کی بہترین مثال ہے کہ جرنیل جب اپنے ملک کو مسخر کر لیتے تو پھر جنرل ایوب خاں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ لڑی، یحییٰ نے ۱۹۷۱ء میں یہی کام کیا۔ ضیا افغانستان میں امریکی جنگ لڑتے رہے، مشرف نے بھی کارگل میں یہی آمرانہ روایت دوہرائی اور افغانستان میں امریکی جنگ کا اس طرح حصے بنے کہ ملک دہشت گردی میں خود کفیل ہو گیا اور دہشت گردی کے حملے فوج کی بجائے فوجی پر ہونے لگے اور فوجی اپنی وردی کی عظمت کو سول کپڑوں میں چھپا کر چھاؤنیوں سے باہر نکلتے۔ اس مضمون کا آغاز احمد بشیر نے جن دو جملوں سے کیا ہے وہ آفاقی حیثیت کے حامل ہیں لکھتے ہیں:

"پاکستان میں جھوٹ اس قدر بولا گیا اور بولا جا رہا ہے کہ اب سچ سننے پر کوئی تیار نہیں ہوتا جس ملک کی رہنمائی تاریخ نہیں کرتی وہ سدا دھکے کھاتا ہے۔"(۸)

"سنگ را بستند و سگ را کشادند" کے عنوان کا حامل یہ مضمون عطا اللہ صدیقی کے خط کا ردعمل ہے جس میں انھوں نے احمد بشیر کو ایک متشدد اور مادر پدر آزاد اور سیکولر دانش گزیدہ اور ہتھ چھٹ قسم کے نقاد کے طور پر یاد کیا ہے اور ہتھ چھٹ بھی ایسے:

"ذہن میں آئی ہوئی ہر بات کہہ دینا ہی ان صاحب کے نزدیک آزادی اظہار کی معراج ہے اس کے قلم کے انگاروں سے شاید ہی کوئی بچ پایا ہو۔"(۹)

اور یہ ردعمل تیرہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں انھوں عطا اللہ صدیقی کو مخاطب کر کے جماعت اسلامی اور اس کے اکابرین کا بے رحمانہ تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں:

"شکریے کی بات یہ بھی ہے کہ جناب عطا اللہ صدیقی نے اس فقیر بے نوا کے کردار کے بارے

میں جو کچھ لکھا صحیح لکھا۔ میں منافقوں، اقتدار پرستوں، عوام دشمنوں، اور جعلی نظریہ سازوں پر تنقید کے معاملے میں واقعی ہتھ چھٹ واقع ہوا ہوں۔"(۱۰)

اس مضمون میں منصورے، میاں طفیل محمد، مولانا مودودی اور دیگر اکابرین اور گوٹھ ماچھی تک میں ہونے والے واقعات کا ذکر شامل ہے اور ساتھ ہی وضاحت کے لیے اس مضمون کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس میں ہر مذہب سے بھی بڑے مذہب انسانیت کی بات کی گئی ہے۔ کشمیر کے حوالے سے اس مضمون میں جامع مسجد دہلی کے امام کی کشمیر میں احترام رمضان کے حوالے سے جنگ بندی کی اپیل کا تذکرہ ہے اور حکومت کی جانب سے اسے تسلیم کرنے کا اعلان ہے اور حریت کانفرنس کا بھی چاروناچار اسے ماننے کے حوالے سے اعلان ہے اور اس کے علاوہ کشمیر کی تحریک آزادی اور کیمونسٹ پارٹی روسی قیادت اور چین میں انقلابی تبدیلیوں کا احوال اس مضمون میں شامل ہے۔ کشمیر میں برپا ہونے والی تحریک اور اس پر بھارتی حکومت کے ظالمانہ ہتھکنڈوں اور رد عمل کے طور پر نئی سوچ اور فکر کا پھیلاؤ جو آزادی کا سلسلہ بتا رہا ہے، کا احوال اس مضمون کی خاص بات ہے۔

ترقی پسند تحریک کے اثرات اور ادب پر نہ ختم ہونے والی بارش کی طرح ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے۔ کبھی موسلا دھار اور کبھی ہلکے پھلکے انداز میں اور کبھی بوندا باندی کی شکل اور کبھی کبھی ہوا میں نمی کے رنگ میں اپنی موجودگی دکھاتی ہے۔ الغرض یہ تحریک آج تک اپنے اثرات کی قوت کے لبادے میں موجود ہے۔ معروف کیمونسٹ دانیال لطیفی سے ہونے والی گفتگو اور اس سے اخذ کردہ نتائج اس مضمون کا حاصل ہیں اور کیمونسٹ پارٹی کے حوالے سے بہت سی معلومات اس مضمون میں ملتی ہیں اور دانیال لطیفی نے مسلم لیگ کا منشور بھی لکھا تھا جو دولتانہ نے بدل دیا تھا کیوں کہ منشور کمیٹی کے چیئرمین وہی تھے اور اس کے علاوہ سوشلزم کے احیا کی تحریک کی معلومات اس مضمون میں موجود ہیں۔ جن سے یہ اہم بات آشکار ہوتی ہے کہ مسلم لیگ کا اوّلین اور عوامی منشور دانیال لطیفی نے لکھا تھا اور وہ خالصتاً عوامی اور انقلابی خصوصیات کا مرجع تھا اور اس کے تمام مقاصد عوامی تھے اور عوامی مقاصد کا کامیابی سے حصول ہی دانیال لطیفی کے پیش نظر تھا۔ مگر جاگیردرانہ نظام نے اسے پریشان کر دیا۔

احمد بشیر کو چندی گڑھ میں پنجابی وفد کے ہمراہ جانے کا موقع ملا تو انھوں نے دونوں طرف کے پنجابوں کی بابت یہ محسوس کیا (مشرقی اور مغربی) کہ لوگ تو آپس میں بڑی محبت رکھتے ہیں مگر حکومتی سطح پر رکاوٹیں موجود ہیں اور دورے کے دوران وہاں کے لوگ ہمارے مرحوم ادیبوں کے نام لے لے کر روتے رہے اور آخر میں احمد بشیر نے کہا کہ پنجابی سیکھنی ہے تو ہم سے رجوع کرو کیوں کہ تخلیقی عمل ہمارے ہاں نمو پا رہا ہے یعنی پنجابی کے لیے عربی رسم الخط ہی بہترین ہے۔ پاکستان کی دفاعی گہرائی کے عنوان کے حامل مضمون میں ملا عمر کے مہاتما بدھ کے مجسموں کو توڑنے پر اپنا رد عمل دنیا کے کئی ممالک کے علماء کا اس کے خلاف بیان اور اس وجہ سے حالات اور خرابی کی طرف جانے کا اشارہ اور معصوم افغان

عورتوں کو زندہ رہنے کے لیے جسم فروشی کرنے کی پیش گوئی طالبان تحریک کی دیگر خرابیاں گندھارا تہذیب کی اہمیت سلطان محمود غزنوی کے لٹیرے پن کا ذکر مذہبی تنگ نظری اور رد عمل کے طور پر بال ٹھاکرے کی ہندوستان میں مساجد اور مزاروں کی فہرستیں جن کی تعداد چالیس ہزار ہے کا ذکر اور اس کے ساتھ احمد بشیر اس مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''اصل میں افغانستان، پاکستان کی دفاعی گہرائی کی ضرورت نہیں بلکہ پاکستان افغانستان کی دفاعی اور جغرافیائی گہرائی کا معاملہ ہے اور اب تو اندیشہ یہ ہے کہ پاکستان افغانستان کی نظریاتی گہرائی کا میدان بنے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ تاریخ میں جس افغان نے درہ خیبر پار کیا وہ واپس نہیں گیا۔''(۱۱)

تاریخی حوالے سے پاک افغان سرزمین کا واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اور جنرل ضیا اور جنرل مشرف کی یس مین جرنیلی کے باعث پاکستان اور افغانستان پر اس کے گہرے اثرات اور آنے والے دور میں ہونے والے نقصانات کی پیش گوئی کی گئی اور تاریخی طور پر بھی یہ بات درست ہے کہ جو افغان ادھر آئے۔ ان میں سے بہت سے پاکستانی شہری بن چکے ہیں کچھ لوگوں کو پیسے دے دلا کر ٹرکوں پر سوار کرا کر بھیج دیا جاتا ہے مگر ان کی بستیاں ویسی ہی آباد ہیں۔

عالمی پنجابی کانفرنس کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں پنجاب اور پنجابیت کے ساتھ کشمیر پر مذاکرات قدیم پنجاب میں فنون لطیفہ اور سیاسی ترقی کا احوال شامل ہے۔ ہندو سرمایہ داری کے اتحاد کا ذکر اور پنجابی کانفرنس کے خلاف لکھنے والے اخبارات کی خبر لینے اور بھرپور جواب اور اس ضمن میں اخبارات میں خبریں چھپنے پر احمد بشیر اپنا رد عمل یوں بیان کرتے ہیں کہ ایسا کرنے یعنی عالمی پنجابی کانفرنس کے خلاف لکھنے والوں کے متعلق ''فقیر یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ جاہل زیادہ ہیں یا بے ایمان زیادہ۔''(۱۲) احمد بشیر کراچی میں یا امریکہ میں بنگلہ دیش میں یا انگلینڈ، جرمنی میں ہوں یا ہندوستان میں انھوں نے اپنا پنجابی تشخص ہر جگہ برقرار رکھا۔ وہ پنجابی بولتے تھے۔ انگریزی اور اردو میں لکھتے تھے۔ سوچوں میں بھی ماں بولی کا جہان آباد تھا۔ اس لیے انھیں چلتا پھرتا پنجاب کہا جاتا تھا۔

ضیائی اسلام کی واپسی کے عنوان سے لکھا گیا یہ مضمون اس بات کا عکاس ہے کہ ڈاکٹر محمود غازی کے مختلف خیالات کی وجہ سے گمان گزرنے لگا ہے کہ پھر سے حسبہ کمیٹیاں بنیں گی اور اس حوالے سے آرڈیننس جاری ہونے کی خبر بھی اس مضمون کے لکھنے کا محرک بنی اور پاکستان کے منہ زبانی بے خبر ادارے اسلامی نظریاتی کونسل کی بے بسی اور ملکی دولت اور طبقاتی ناہمواری اور صحیح جمہوریت کی طرف اشارے اور موجودہ حالات میں ہر نظام کی ناکامی کا دعویٰ اس مضمون کے اہم نکات ہیں۔ مشرف دور میں عوامی توجہ کے حصول کے لیے آمرانہ ہتھکنڈوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریاتی کونسل کی لانظریاتی حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نظریاتی ملک جو نظریہ پاکستان، نظریہ ضرورت جیسی برکتوں کا حامل ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نظریاتی تو کجا وہ اسلامی کونسل بھی نہیں لگتی بس ایک آئینی ادارہ ہے۔ جو متعلقہ

لوگوں کو نوازنے اور حکومت وقت اپنی حمایت میں بیان دلوانے اور پُرسکون سہولیات پر تشکر کے طور پر ان لوگوں کو زبان بتیس دانتوں میں رکھنے کا کہا جاتا ہے۔

ایک مضمون میں احمد بشیر پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اہم نکتہ بیان کر رہے ہیں اور بھارت کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ وہ کشمیر سمیت تمام مسائل حل کرے جس کے لیے صرف گدھے سے ایک فیصد زیادہ عقل کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے آگرہ مذاکرات اور تاریخی حوالے سے بھی بات کی گئی ہے۔ بحیثیت پاکستانی وہ اس مسئلے کا حل پاکستانی عوام کی امنگوں کے عین مطابق درج ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''ہم ہندوستان سے تجارت کے علاوہ مشترکہ صنعتیں لگانے پر تیار ہیں۔ کلچرل تعلقات بڑھانے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں مگر کشمیریوں کو جو کچھ ان کا ہے اور جس کا تم وعدہ کر چکے ہو واپس کر دو۔ فقیر کے خیال میں پاکستان میں گدھے سے صرف ایک فیصد زیادہ عقل ہے تو وہ چین کو نہیں چھوڑے گا اور میرے خیال میں پاکستان گدھے سے ایک فیصد زیادہ عقل رکھتا ہے۔ کیا ہندوستان میں بھی گدھے سے ایک فیصد زیادہ عقل ہے۔''(۱۳)

کشمیر پاکستان اور بھارت میں بنیادی اختلاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ احمد بشیر نے بھی اپنے تجزیے میں بتایا ہے کہ مشرف اور واجپائی حکومت میں آگرہ میں اس حوالے سے خاصی پیش رفت ہوئی مگر واجپائی کے علاوہ بھاچپائیوں نے اسے آخری وقت پر ''کہہ مکرنی'' بنا کے رکھ دیا۔ فوجی آمریت یا فیوڈل آمریت کے عنوان کے حامل اس مضمون میں ملک کے منتخب نمائندوں کی کرپشن اور نااہلی اور من حیثیت القوم ہماری کام چوری اور لوٹ مار کی عادت کے کلچر کی جڑیں پکڑنے کی طرف بڑی وضاحت سے بات کی گئی ہے اور جاگیرداروں کو جاگیریں پانے پر انھیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ لکھتے ہیں:

> ''فقیر کو تکلیف اس بات کی ہے کہ انھوں نے ایک کلچر تخلیق کیا جس کے تحت مفت خوری، حرام خوری اور کسی تخلیقی محنت کے بغیر پیسہ بنانا برحق سمجھا۔ اس لحاظ سے ہمارا چپڑاسی اور ہمارا مزدور بھی فیوڈل ہے کیوں کہ وہ بھی کام چوری کرتا ہے اور کم سے کم محنت کر کے پوری مزدوری مانگتا ہے اور یہی کلچر ہمارا قومی کلچر ہے۔ جمہوری آمریت یا فیوڈل آمریت اس کلچر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی فیوڈل کلچرل پاکستان پر حاوی ہے اور جب تک فیوڈل ازم کا خاتمہ نہ کیا جائے گا، فیوڈل کلچر ہی ہمارا قطب نما ہو گا اور ہمارے حالات بد سے بدتر ہوتے جائیں گے۔ فیوڈل کلچر کے علاوہ پاکستان کے مسائل دو ہی ہیں۔ ایک جہالت دوسرا کثرت آبادی اور ان دونوں مسائل کی جڑ بھی فیوڈلزم میں پیوستہ ہے۔''(۱۴)

احمد بشیر نے اس مضمون میں اور دیگر کئی انگریزی اور اردو مضامین اور کالموں میں بھی یہ بات لکھی ہے کہ ملک

میں جب تک وڈیرہ شاہی یعنی فیوڈل ازم کا خاتمہ نہیں ہو گا اس وقت تک ہر حکومت میں یہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہیں گے اور بڑے سے بڑا آمر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ پائے گا۔ ریاست اور موسیقی کے عنوان کے حامل مضمون میں استاد بدر الزماں کی موسیقی کے حوالے سے میاں نعمت خان سدا رنگ پر لکھی جانے والی کتاب پر بھرپور تبصرہ ہے اور فن موسیقی کی تاریخ سازوں کی ایجاد اور کن کن کتابوں اور کن کن علاقوں سے کون کون سی موسیقی یا رقص برصغیر میں آیا اور اس پر عربی، فارسی اور ازبکستانی زبانوں اور تانوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے اور مزید کیا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مزید کتاب کی فرمائش اس مضمون کا حاصل ہے اور احمد بشیر کی موسیقی اور موسیقی کی تاریخ سے آگاہی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس ضمن میں اظہر جاوید لکھتے ہیں:

> ''احمد بشیر جو کچھ لکھ گئے ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے ذہن و دل میں موجود تھا۔۔۔ وہ تو موسیقی پر بھی کتاب لکھ سکتے تھے۔ پتا نہیں کیا کیا لکھ سکتے تھے۔ لیکن پھر وہی کاش۔۔۔۔ جو ہم ایسوں کو قاش قاش کر دیتا ہے۔''(۱۵)

موسیقی سے احمد بشیر کو بہت پیار تھا راگداری کی جانکاری میں انھیں کمال حاصل تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے گھرانوں اور ان کی ترقی کے زمانوں سے بھی مکمل آگاہی رکھتے تھے۔ اسی مضمون میں راگ داری کے کمال کے زمانے کے حوالے سے احمد بشیر لکھتے ہیں:

> ''یہ طرفہ تماشہ ہے کہ ہماری راگ داری صرف اس وقت کمال کو پہنچی جب ریاستی مرکزیت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ شاعری بھی اس زمانے میں بکھری (کذا۔ نکھری) اور اس سلسلے میں محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ کے زمانے کمال کے زمانے تھے۔''(۱۶)

یعنی اسلامی سلطنت کے زوال کا زمانہ ان علوم و فنون کے عروج کا زمانہ تھا۔ واجد علی شاہ نے تو باقاعدہ سازندوں کی پوری ٹیم بنائی ہوئی تھی۔ پانچ سو سازندوں کی سنگت ہوتی تھی۔ دیسی سازوں کے ساتھ ساتھ کچھ مغربی ساز بھی اس موسیقی ٹیم میں شامل تھے۔ رقص ہوتا، الغرض اس زوال میں کلچر نے بڑا عروج حاصل کیا۔ محمد شاہ کو ملنے والا عوامی لقب ہی اس کے سارے دور کا عکاس ہے۔ اس کا کام بڑا توانا تھا۔ دربار بھی رقص گاہ بن چکا تھا اور ''ہنوز دلی دور است'' کے نعروں سے گونجتا تھا اور بسنت بہار کے نعروں کی خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔

احمد بشیر نے فلمی تربیت بھی امریکہ سے حاصل کی۔ ان کا اکلوتا بیٹا اپنی بڑی بہن کے توسل سے امریکہ میں کامیاب کاروباری بن چکا ہے اور وہ خود بھی ایک سے زیادہ مرتبہ امریکہ یاترا پر جا چکے ہیں۔ مگر ان کی قلمی حالت جنگ بگل بجا دیتی ہے۔ اور وہ اپنے ایک مضمون میں امریکہ کو سب سے بڑا دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ ۱۹ویں نمبر پر شامل کتاب مضمون کا عنوان ہے اور دنیا کے کمزور اور امریکی مفادات کے حامل ممالک کی اقتصادی، سیاسی، اور سماجی حالت کو بگاڑنے

اور سنوارنے کے سلسلے کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے امریکہ جو حربے استعمال کرتا ہے اور ان ممالک میں اپنے پسندیدہ کرپٹ اور عوامی لوٹ مار کے حامل لوگوں کی پشت پناہی کر کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر طرح کے حربے بروئے کار لا کر ان ممالک کو کمزور اور اپنے مفادات کو طاقتور بناتا ہے اور ان ممالک میں پائی جانے والی معدنی دولت کے حصول کے لیے ہر غیر اخلاقی ہتھکنڈہ بروئے کار لاتے ہوئے وہاں کے لوگوں کی جانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر بے جان بناتا جاتا ہے اور احمد بشیر نے اپنے مخصوص اسلوب میں تاریخی حوالے سے اس مضمون میں اظہار خیال کیا ہے۔ امریکی چیرہ دستیوں اور گرفت میں آئے ہوئے ممالک کی پستیوں پر احمد بشیر نے کھل کر لکھا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں نائن الیون کے حوالے سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور حیران کن حد تک شاندار کیمرہ مین اور دیگر حوالوں اور خبروں کے ذریعے سے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے اور اس کے پیچھے بھی امریکی مفادات کا جذبہ موجزن ہے اور اپنے مفادات کے حصول کے لیے انھوں نے کس طرح صدام حسین کو کویت پر حملے کے لیے اکسایا۔ صدام کے اس فعل کو جواز بنا کر امریکہ نے مستقل طور پر سعودی عرب، کویت اور عراق میں ڈیرے لگائے اور دونوں جگہ مسلمانوں کا خون بہایا۔

احمد بشیر کا مضمون "وہ اپنی خو نہ بدلیں گے" بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں بھی احمد بشیر نے جمہوری سلسلے اور ہمارے ملکی معاملات اور اس میں ہماری سیاسی جماعتوں کے کردار کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ علما کو حکومت ملنی چاہیے تاکہ ان کی اصل حقیقت سے لوگ باخبر ہو کر ان سے جان چھڑا سکیں۔ اس ضمن میں احمد بشیر جمہوری سلسلے کی بقا کے لیے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں: "اس ایک مہینے کے بکھیڑے میں میری سمجھ میں یہ آیا کہ جمہوریت ہماری قوم کی بقا کے لیے نہیں بلکہ ہماری قوم جمہوریت کی بقا کے لیے ہے۔"(۱۷)

احمد بشیر کی تحریروں نے عام آدمی کے ساتھ ساتھ بڑے لوگوں کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہشت پہلو شخصیت کے حامل انور مقصود کا فیس بک پر موجود یہ بیان بھی اس بات کا غماز ہے کہ ایسے لوگوں پر بھی بشیر وی آسیب اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ "پاکستان میں ۸۰ سالہ بزرگ کا پینشن لینے کے لیے خود بینک آنا ضروری ہے لیکن ایک اشتہاری کو سینٹر بننے کے لیے پاکستان آنا ضروری نہیں۔۔۔ لعنت ہے ایسی جمہوریت پر۔ (۱۸)

یعنی جمہوریت سے قوم کو کچھ حاصل نہیں ہو گا مگر قوم جمہوریت کے لیے قربانی دیتی رہے یہی اس کا کام ہے اور اسی میں اس سسٹم کے چلانے والوں کی بقا ہے جس کا عوام سے تعلق نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ "برادران یوسف" کے عنوان سے مضمون میں انھوں نے اپنے پیشے سے وابستہ لوگوں کی خبر لی ہے جو صحافتی اقدار کی پامالی اور اپنی خوشحالی کے سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہیں اور اخبار کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ایجنسیوں، اور سیاسی جماعتوں کے مفادات کے تحفظ کی قیمت بھی وصول کرتے ہیں اور سچ لکھنے والوں کو بھی تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اس ضمن میں احمد بشیر کی سچائی کے رد

عمل کے طور پر جناب عطاالحق قاسمی صاحب نے اپنے کالم میں احمد بشیر کے متعلق نازیبا زبان استعمال کی جسے دوسرے یا مہذب لفظوں میں گالی کہا جاتا ہے۔

احمد بشیر کا تعلق صحافیوں کے اس قبیلے سے تھا جو ہاتھوں میں سچ لکھنے والا قلم رکھنے اور سچ لکھنے کے ہنر سے بہرہ مند تھا۔ انھوں نے ملکی حکمرانوں کی مفاد پرستی کی قلعی کھولنے میں کسی مصلحت کو پیش نظر نہیں رکھا۔ بڑے بڑے جغادری کسی حکمران کی وفات تک اپنے قلم کی روشنائی کو قلم میں اور زبان کو بتیسی میں دبائے رکھتے ہیں۔ مگر احمد بشیر ان کا کچا چٹھا ان کی زندگی میں اور ان کے دورِ حکمرانی میں ہی کھول کر رکھ دیتے تھے۔ چاہے وہ بھٹو ہو، جنرل ضیا ہو، زرداری یا بینظیر ہو، مشرف یا نواز شریف ہو جو ان کے ہوتے ہوئے دوبارہ وزیر اعظم بن چکا تھا اور وہ ۲۰۱۳ء سے پھر وزیر اعظم بنا اور پانامہ لیکس نے اس کے مالی اور کاروباری سلسلے کو "کاروکاری" کر کے رکھ دیا اور آج کل ہماری ملک کی آزاد عدالتوں سے سزا کا سہرا سجا کر اور معزولی کی مالا گلے میں سجا کر زمستان پور کی مکمل آزاد فضا میں سہولت سے قید کاٹ رہا ہے۔

الغرض احمد بشیر کی علمی برتری، سیاسی پختگی، تاریخی شعور، تجزیاتی قوت، رواں جداگانہ اور بے باکانہ اور ان کے مطابق غیر جانبدارانہ انداز، ادبی اور جمالیاتی رعنائی ان کی اُردو مضمون نگاری میں جلوہ نما ہے۔ وہ قدیم ہندوستان کی جدید تعمیر و ترقی کی بابت لکھتے ہیں:

> "مسلمانوں نے آکر ہندو روایت کا مسلمان تہذیب سے امتزاج کیا اور راگ رنگ ایجاد کئے کتھک ناچ ایجاد کیا مصوری رائج کی عمل جہانداری سکھایا مردوں کو کپڑے پہنائے۔ تعمیرات کا ایک سٹائل دیا شہر بسائے، تاریخ نویسی سکھائی۔ اجتماعی زندگی کا تصور دیا اور جات پات کے بندھنوں کو ڈھیلا کیا آج کل ساری دنیا میں ہندوستان کی تہذیبی عظمت کا شہرہ ہے مگر اس عظمت میں مسلمانوں کا حصہ کچھ زیادہ ہے۔"(۱۹)

بینظیر نے انھیں ادب و صحافت میں تمغہ حسن کارکردگی دیا مگر جب سچائی کی بات آئی تو انھوں نے اس کی ذرہ برابر پروانہ کی اور دنیاوی شاہی کا نقارہ بردار بننے کی بجائے فقیری کو پسند کیا اور اس کا اعتراف وہ یوں کرتے ہیں:

> "اپنی بدتمیزیوں اور گستاخیوں کی وجہ سے فقیر کی آدھی صحافتی زندگی بے روزگاری میں گزری اور بجا طور پر میں نے پاکستان کی لوٹ دیکھی۔ ایوب خان کی لوٹ دیکھی ضیاء الحق کی لوٹ دیکھی۔ بے نظیر کی لوٹ دیکھی۔ نواز شریف کی لوٹ دیکھی لیکن میں نے اپنی سیاست اپنا ضمیر اپنا ایمان نہ بیچا۔"(۲۰)

پاکستانیوں کو وہ اپنا نظریاتی پیغام دیتے ہوئے انھیں مساوات پر مشتمل زندگی کرنے کا اور ترقی کا راستہ دکھاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اے شیشہ گرو تم اللہ رسول کو مانو۔ عبادت کرو، قرآن شریف باقاعدہ پڑھو، مگر سیاسی طور پر سیکولر ہو جائو۔ پھر تم طبقاتی حکمرانی بھی منظم کر سکو گے ترقی بھی کر سکو گے اور حکمران بھی خود بن جاؤ گے۔ خیالات آسمان سے نہیں اترتے بلکہ لوگوں کے سماجی مقام سے آتے ہیں۔ اپنا سیاسی مقام بہتر کرو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنا سیاسی اور اقتصادی نظام درست کرو اور جو کچھ قائداعظم نے کہا اس پر غور کرو۔ ورنہ تمہارا نام تک بھی نہ ہو گا داستانوں میں۔"(۲۱)

احمد بشیر کے سچ سے اختلاف ممکن ہے مگر اس کی شخصی سچائی سے مفر ممکن نہیں۔ وہ پاکستان کے قیام، وجود اور استحکام کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے اور ہر حال میں رجائیت کی شمع روشن رکھنا ان کا مشن تھا۔ یہ تمام مضامین ماہنامہ نیا زمانہ میں چھپے ہیں اور ان کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ شعیب عادل ایڈیٹر ماہنامہ نیا زمانہ کے اس بیان سے ہوتا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ "نیا زمانہ" آج جس مقام پر ہے وہ صرف اور صرف احمد بشیر کی وجہ سے ہے اور یہ "نیا زمانہ" ہی ہے جس نے احمد بشیر کی تمام تحریریں بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے شائع کیں کیوں کہ ۱۹۷۷ء سے ۲۰۰۰ء تک ان کے اردو میں مضامین نہ ہونے کے برابر تھے۔"(۲۲)

یہ اعتراف جہاں احمد بشیر کی فنی، فکری، ادبی، صحافتی اور شخصی بڑائی کا غماز ہے۔ وہاں صحافت کی سچی پاسداری اور خدمات میں "نیا زمانہ" اور شعیب عادل کے کردار کا بھی اظہار ہے۔ "خون جگر ہونے تک" کے شروع میں شعیب عادل لکھتے ہیں:

"اردو ادب میں جو مقام سعادت حسن منٹو کا ہے صحافت میں وہی مقام احمد بشیر کو حاصل ہے۔۔۔ نیا زمانہ کو موجودہ مقام تک لانے کے لیے انھوں نے اپنی بھرپور صلاحتیں صرف کر دیں۔"(۲۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ "نیا زمانہ" کے قارئین کو نئے اور پرانے زمانوں سے آگاہی کا دوسرا نام صرف اور صرف احمد بشیر ہے۔ تنویر قیصر شاہد اپنے کالم "تعاقب" میں لکھتے ہیں:

"برادرم شعیب عادل نے لاہور سے نیا زمانہ کی اشاعت کا اہتمام کیا تو احمد بشیر کی تحریریں باقاعدگی سے اس کے حسن میں اضافے کا سبب بننے لگیں۔۔۔ لیکن ان کی یہ آخری تحریریں بعض مذہبی حلقوں کو بہت ناگوار گزریں۔ لاہور کی ایک مذہبی اور جہادی تنظیم تو انھیں مارنے کے درپے ہو گئی تھی۔"(۲۴)

مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا مگر ہمارے ہاں ایسی روایت "کلیاتِ اقبال" تک محدود ہے۔ فکرِ اقبال کی تمام جہتیں ہمارے لیے زود ہضم نہیں۔ ہم ہر کتاب بشمول قرآن کو "حادث" کی سان پر چڑھاتے ہوئے اپنے مطلب

یا مقصد کی تفسیر کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات کی پیروی کی بجائے ان تعلیمات کو اپنی رشحات فکر کی لکیر کی فقیری کی دستار عطا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اس سے اختلاف، انحراف، انکار یا فرار اور پھر اس کا سرِ عام اظہار ہمارے ہاں بعض مذہبی طبقات میں کسی صورت قابلِ قبول نہیں ایسا کرنے پر تابڑ توڑ فتوے شروع ہو جاتے ہیں جن کی تان گردن زدنی پر ٹوٹتی ہے۔ احمد بشیر کا اختصاص یہ ہے کہ وہ اس اسیری لمحے کو بھی سووٹ کا تڑکہ لگانے میں بھرپور طریقے سے کامیاب رہے اور اس گردن زدنی ماحول اور مار شلائی موسم میں بھی اپنے محاذ پر ڈٹے رہے اور اس ثابت قدمی کی بدولت اردو، انگریزی ادب و صحافت کا دامن نایاب، سدا بہار، پُر وقار، شاندار سچائی کی میگھ ملہار، جمالیات کی نعمت سے سرشار اور ادبی شان کی عظمت سے ہم کنار تحریروں سے معمور ہوا۔ مجید احمد لکھتے ہیں:

> ''وہ ادیب بڑے کمال کے تھے کیسے کیسے خوبصورت جملے لکھتے تھے۔ اگر کوئی خوبصورت جملے پڑھنا چاہے تو ان کی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' اگر کسی کو احمد بشیر کی صاحب بیبا کی دیکھنی ہو تو ان کا ناول ''دل بھٹکے گا'' پڑھے اور اگر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ احمد بشیر کتنے نڈر تھے بہادر اور کتنے باغی صحافی تھے تو ان کے کالموں کا مجموعہ Dancing with wolves اور ''خون جگر ہونے تک'' پڑھے۔''(۲۵)

احمد بشیر کی باغیانہ، صحافیانہ اور ادیبانہ جہتیں ان کی کسی نہ کسی کتاب کا بھرپور تعارف اور پہچان ہیں۔ لکھتے وقت خون جگر کی روشنائی کو بروئے کار لانا، زمانے کے جغادریوں اور بھیڑیوں کے ساتھ بہادری سے رقصاں رقصاں ہونا، جادوگروں، کشور کی ناہیدیوں، مولانا لوگوں کی ''پری چہرہ''، ''مصروفیتوں'' پینے پلانے اور اس بازار میں جانے کی ''کتھا'' کا نام احمد بشیر ہے۔ جو لاہور، پنجاب، پاکستان اور قدیم ہندستان سے سچا پیار کرنے والے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ شعیب عادل، وہ ایک مرد دانا تھا، مشمولہ: ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور: فروری ۲۰۰۵ء، ص:۳۵

۲۔ احمد بشیر، خون جگر ہونے تک، لاہور: آواز اشاعت گھر، س۔ن، ص:۱۰

۳۔ ایضاً، ص:۱۱

۴۔ امتیاز عالم، باد مخالف سیاح، مشمولہ: ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور: فروری ۲۰۰۵ء، ص:۳۷

۵۔ احمد بشیر، خون جگر ہونے تک، ص:۱۰

۶۔ ایضاً، ص:۲۲

۷۔ ایضاً، ص:۲۹۔۳۰

۸۔ ایضاً، ص:۲۴

۹۔ عطاء اللہ صدیقی، مشمولہ: سنگ را بستند و سگ را کشادند، خون جگر ہونے تک، ص:۳۲

۱۰۔ احمد بشیر، خون جگر ہونے تک، ص:۳۳

۱۱۔ ایضاً، ص:۶۷

۱۲۔ ایضاً، ص:۷۳

۱۳۔ ایضاً، ص:۹۳

۱۴۔ ایضاً، ص:۹۵

۱۵۔ اظہر جاوید، اوپر سے پتھر اندر سے موم، مشمولہ: ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور: فروری ۲۰۰۵ء، ص:۴۷

۱۶۔ احمد بشیر، خون جگر ہونے تک، ص:۱۱۱

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۷۴

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۱۷

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۸۴

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۵۸

۲۱۔ شعیب عادل، فروری ۲۰۰۵ء ص:۳۵

۲۲۔ شعیب عادل، 'آغاز' مشمولہ: 'خون جگر ہونے تک' لاہور: آواز اشاعت گھر س۔ن، ص:۵۔۶

۲۳۔ تنویر قیصر شاہد، تعاقب، کالم مشمولہ: روزنامہ پاکستان، لاہور: ۱۲ جنوری ۲۰۰۵ء

۲۴۔ احمد بشیر دراصل میدان علم و ادب و صحافت میں خطروں کے کھلاڑی تھے اور ہر مشکل اور پریشانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ "سووٹ" کا نعرہ مستانہ لگا کر زندگی کرنے کے عمل کو بلا خوف و خطر جاری رکھتے تھے۔

۲۵۔ مجید احمد، احمد بشیر کی یاد میں، مشمولہ: ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور: دسمبر ۲۰۰۵ء ص:۴۵